

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

# اشارات

گذشتہ عوامہ کے اشارات میں ہم نے حکمران طاقت کو ان ذمہ داریوں اور مطلوبہ تغیرات کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی ہے جن کا تقاضا نیا دستور کرتا ہے۔ اس مرتبہ ہم اپنا رویے سخن پاکستان کے عوام اور شہریوں کی طرف پھیرتے ہیں۔

دستور کا خیر مقدم جس جذبہ و جوش کے ساتھ عوام نے کیا ہے اور یوم جمہوریہ اسلامیہ پاکستان کی تقریب جس دلی ذوق و شوق سے منائی ہے، اس کا انہیں فی الواقع حق پہنچتا تھا۔ یوم آزادی کی سرکاری تقریب کے مقابلے میں یہ تقریب صحیح معنوں میں خوامی تھی اور اسی وجہ سے اس کا معیار اور پیمانہ زیادہ اونچا رہا۔ پاکستان کی ایک ایک مسجد میں اسلام اور پاکستان اور ملت کی سر بلندی کے لیے دعائیں مانگی گئیں، دستور کے موضوع پر جامع مساجد میں خطبات دئے گئے، جلسوں میں اسلامی نظام پر تقریریں کی گئیں، شکرانہ کے نوافل پڑھے گئے، غریبوں کو کھانے کھلائے گئے اور مختلف اسالیب سے لوگوں نے اپنے جذبات مسرت کا اظہار کیا۔ یہ فی الواقع ایک حقیقی مسرت کا موقع تھا۔ ہماری سیاسی و قومی تاریخ میں ایک بڑا دن ۱۲ اگست ۱۹۴۷ء کا تھا اور اب دوسرا بڑا دن ۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء کا دن قرار پایا ہے۔ اس دن ہمارے جغرافیے میں ایک تبدیلی واقع ہوئی تھی اور اس دن سے ہماری تاریخ میں تغیر آ رہا ہے۔ اس دن زمین کی لوح پر نئی لکیریں کھینچی گئی تھیں اور اس دن ہماری زندگی کے نامہ تقیر پر نئے نقوش نمودار ہو رہے ہیں۔ اس دن نئی زندگی کا محض نیا قالب کھڑا کیا گیا تھا، اور اس دن اس قالب میں اصول و مقصد کی روح پھونکی جا رہی ہے۔

نئے دستور میں اگرچہ خوبیاں ہی خوبیاں نہیں، قابل اصلاح خرابیاں بھی موجود ہیں، لیکن جن وجوہ سے

ہمیں کا خیر مقدم پوری گرم جوشی کے ساتھ کیا گیا ہے، وہ یہ ہیں :

— آزاد ہونے کے باوجود آٹھ برس کی لمبی مدت تک ہمارا اپنا کوئی دستور نہ تھا اور ہم ایک غیر قوم کے متروک دستور کے تحت شتم پشیم کام چلا رہے تھے۔ زندگی کے لیے کوئی نظریہ نہ تھا، عمل کے لیے نصب العین کی کوئی منزل نہ تھی، منزل تک لے جانے والا راستہ عین نہ تھا، تعمیر کا کوئی نقشہ طے نہ تھا، گویا ہم اندھیرے میں بھٹکتے پھر رہے تھے۔ اب ہمارے ہاتھوں میں اپنا تیار ہوا ایک دستور ہے، اس دستور میں ایک ملی نصب العین طے کر دیا گیا، اس نصب العین کے اصولی تقاضے متعین کر دئے گئے ہیں اور یہ حیثیت ایک مسلم ملت کے ہم نے مطلوبہ تبدیلیوں کو اس دستوری نقشے میں سامنے رکھ لیا ہے۔ اب ہم خدا خدا کر کے دنیا کی آزاد اقوام سے آنکھیں چار کرنے کے قابل ہوئے ہیں۔

— ہماری آزادی اور ہماری حاکمیت ۲۲ مارچ ۱۹۴۷ء کے نیم شب تک ملکہ برطانیہ کی فائزرگی کرنے والے، "فرد واحد" کے پاس رہن تھی اور اب ۲۳ مارچ سے اس کا فک رہن عمل میں آیا ہے۔ اس سے قبل ۱۹۴۵ء کے ایکٹ کے رو سے سرے سے ہمارا کوئی شہری حق نہ تھا، اب پہلی مرتبہ ہم دستوری حیثیت سے کچھ نہ کچھ شہری حقوق کے مالک ہوئے ہیں اور ایک آزاد ریاست کے شہریوں کے مرتبے کو پہنچے ہیں۔

— گو ملگو کا ہشت سالہ دور جس میں ایسے مواقع پیدا ہوئے کہ امریت اپنے ڈراؤنے پھرے کے ساتھ قومی زندگی کے دروازے سے آکر جھانکتی رہی، اس دستور کے نفاذ کے ساتھ ختم ہو گیا۔

— سب سے بڑھ کر یہ کہ اس دستور میں خدا کی حاکمیت کے اقرار کے ساتھ یہ بنیادی اصول مان لیا گیا کہ قانون سازی کا اساسی سرچشمہ اور معیار فیصلہ کتاب و سنت کی مشروعیت ہوگی۔ یہ اسلامی رجحان کی ایک کھلی کھلی فتح ہے۔ الحاد پند مغرب زدہ عناصر پر۔ باوجودیکہ اس اصول کو عمل میں لانے کے لیے جو طریق کار تجویز کیا گیا ہے وہ حد درجہ ناقص اور ڈھیلا ڈھالا ہے، تاہم ایک مسلمان قوم کے اندر اس اصول کے طے پا جانے کے بعد کسی طاقت کی یہ مجال نہیں ہو سکتی کہ وہ کتاب و سنت کے خلاف قانون سازی کرتی چلی جائے۔

یہ چند ایسے کھلے کھلے وجوہ ہیں جنہوں نے ۲۲ مارچ کی تقریب پر عوام کے دلوں میں ایک نئی روح دوڑا دی ہے

دستور — اور بڑی حد تک جمہوری و اسلامی دستور — حاصل کر لینے کے اس عظیم الشان واقعہ میں چند قیمتی سبق پوشیدہ ہیں، عوام کو چاہیے کہ ان قیمتی اسباق کو اخذ کریں۔

پہلا سبق یہ ہے کہ اگر کسی ملک کے عام لوگ ایک مطالبہ حق پر جم جائیں اور کسی حال میں اسے چھوڑنے اور بھلا دینے پر تیار نہ ہوں تو کسی نال منول، کسی سازش اور کسی تشدد سے ان کا راستہ نہیں روکا جاسکتا۔ بڑی سے بڑی طاقت اور سرکش سے سرکش قیادت کو ایک نہ ایک دن اس کے سامنے جھکنا پڑتا ہے۔

دوسرا سبق یہ ہے کہ سیاست کے دائرے میں کوئی مقصد بغیر اس کے حاصل نہیں ہوتا کہ مختلف جماعتیں اور عناصر اور عام لوگ چھوٹے چھوٹے اختلافات اور نزاعات کو بالائے طاق رکھ کر آپس میں متحد ہوں، مل جل کر جدوجہد کریں اور منظم طریقے سے اپنا مطالبہ سامنے لائیں۔

تیسرا سبق یہ ہے کہ پرامن آئینی جدوجہد سے وہ کچھ حاصل ہوتا ہے جو خلاف قانون تخریبی طریقوں اور غیر اخلاقی سہنگامہ آرائیوں اور اندھے جوش کے طوفانوں سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ پاکستان کی تاریخ میں شورش انگیزی اور ہڑتوں کے ذریعے سے آج تک جو نتائج پیدا کئے جاسکے ہیں ان سب کے مقابلے میں آٹھ برس کی پرامن اور منظم دستوری جدوجہد کا حاصل زیادہ گراں بہا ہے۔ اس گراں بہا حاصل کے لیے اگرچہ لوگوں نے نیندیں حرام کیں، مال صرف کیے، تار دیے، محضر نامے بھیجے، جلسوں میں قراردادیں پاس کیں، لیکن کبھی ایک مرتبہ بھی قانون شکنی نہیں کی گئی، نہ کسی ایک موقع پر عوام بے قابو ہوئے، چنانچہ کوئی ایک قطرہ خون بھی نہیں گرتے پایا۔ محض نظم اور اخلاق اور دلیل کی قوت سے چار جانب سے حملہ کرنے والی سخت مخالف طاقتوں کا زور توڑ دیا گیا۔ لوگ کہتے تھے کہ تاروں اور محضر ناموں سے کیا ہوتا ہے، لیکن جمہوری لحاظ سے اچھے حالات نہ ہونے کے باوجود جمہوری و آئینی طریق کاری اس فتح سے ملک کے تعمیر پسند عناصر کے ہاتھ مضبوط ہو گئے ہیں، اور شورش پسند طاقتوں کا وزن کم ہو گیا ہے۔

ان اسباق کو گروہ میں باندھ کر ادائے فرض کے باقی ماندہ مراحل کو بھی اتحاد، استقلال، تنظیم اور آئین پسند طریق کار سے طے کرنے کا اہتمام کیجیے اور ٹھنڈے دل سے سوچیے کہ آئندہ آپ کو کس مزاج کے لیڈروں اور کس طرز کی جماعتوں کے ساتھ لگ کر چلنا ہے۔

عوام سے کہنے کی سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یومِ جمہوریہ اسلامیہ کا جتن منالینے پر کام ختم نہیں ہو گیا کہ اب آپ بسترِ جگر دماز ہو جائیں اور کمریں کھول کر چین کی نیند سو جائیں بلکہ اصل کام کا آغاز ۲۳ مارچ سے ہو رہا ہے اب تک تو سارا جھگڑا قومی زندگی کے نقشہ تعمیر پر تھا۔ نقشہ تعمیر کے طے پاٹے بغیر ایک اینٹ بھی نہیں رکھی جاسکتی رکھی جائے تو محنت کا صرف بے جا ہوگا۔ اب نقشہ تعمیر کے طے پا جانے پر عمارت کو اٹھانے کا کام شروع ہو رہا ہے۔ آٹھ برس سے زندگی کے مستقبل کی عمارت کے بارے میں یہ بحث چل رہی تھی کہ آیا اسے ایک میکرہ ہونا چاہیے، صنم خانہ ہونا چاہیے، کلب ہاؤس ہونا چاہیے یا ایک دارالاسلام ہونا چاہیے۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ لمبی بحث ان لوگوں کے حق میں فیصل ہو گئی ہے جو پاکستان کو کتاب و سنت کے اصولوں کے مطابق اسلام کا گھر بنانا چاہتے تھے۔ اب ایک متعین نقشہ سامنے ہے، لیکن یہ نقشہ از خود عمارت میں نہیں بدل جائے گا، اس کے رہنا اصول کوئی جادو کا کرشمہ نہیں دکھائیں گے، اس کی دعوات اٹھ کر انجینروں اور راج مزدوروں کا کام نہیں سہرا بنام دیں گی اور نہ اس کے الفاظ عمارت کے لیے مطلوبہ سالہ بن سکتے ہیں۔ عمارت تو خود ہم ہی کو بنانی ہے، ہم میں سے انجینئر اور راج اور بڑھتی بھی اٹھیں گے، ہمیں کو مزدور بن کر اس کے لیے سالہا سال مشقت کرنی ہوگی، اور ہمیں کو اپنے بہترین افکار و جذبات اور اعمال و کردار کا سالہ اس کے لیے فراہم کر کے دینا ہوگا۔ ایک ایک رذہ اٹھاتے ہوئے ہم ہی اسے منڈیروں اور مناروں اور کنگروں تک لے جائیں گے، جب کہیں جا کر نیکی اور سلامتی کا ایک گھر تعمیر ہوگا جس کے سایے میں ہم اور ہماری آئندہ نسلیں سکھ پائیں۔ یہ ایک عالم نو کی تعمیر کا کام ہے اور یہ جیسی ہوگا کہ بچ بچہ صبا سے احساسِ فرض سے سرشار ہو کر اٹھ کھڑا ہو اور خونِ سپینہ ایک کر دینے کے لیے تیار ہو جائے ورنہ اگر ہم لوگ سو گئے تو جب بھی آنکھ کھلے گی بجز ایک کاغذ کے پرزے کے اور کچھ ہمارے سامنے نہ ہوگا۔

خوب سمجھ لیجیے کہ ہمارے دستور میں خوبیاں بھی ہیں اور نقائص بھی۔ وہ روشن رخ بھی رکھتا ہے اور تاریک پہلو بھی! اس کے روشن رخ کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر کوئی مخلص طاقت پر سرِ عمل ہو تو وہ پورے کاپورا اسلام قائم کر سکتا ہے اور یہ دستور اس کے ہاتھ نہیں باندھتا۔ اس کے تاریک پہلو کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر کوئی فرارِ پسند طاقت کا ذریعہ ہو تو وہ دستور کے تقاضوں سے انحراف کر سکتی ہے، ماں مٹول سے ہم لے سکتی ہے اور یہ دستور اس کو کسی تعمیر

صلاح پر مجبور نہیں کرتا۔

ایسے دستور پر جو ریاست بنی ہو وہ غیر معمولی حد تک مضبوط رائے عام کی محتاج ہے۔ اس میں بھلے برے کا سارا دار و مدار عوام پر ہو جاتا ہے۔ اس طرح کے مرکب دستور کو لے کر چلنے والی مملکت کے عوام کی ذمہ داریاں حسب ذیل ہیں :

اولاً، وہ حکومت کے تمام معاملات اور اس کے اندر ہونے والے تغیرات سے براہِ راست گہری دلچسپی لیں اور مسائل کا پورا پورا شعور حاصل کریں۔ وہ اپنے کارپردازوں اور نمائندوں پر کڑی نگاہ رکھیں اور تنقید و احتساب کے فرض سے غافل نہ ہوں۔ وہ ایسی ذہنی فضا تیار کر دیں کہ جس کے ہوتے ہوئے کسی طاقت کو دستور کے اسلامی اور جمہوری تقاضوں سے انحراف کی جرأت نہ ہو سکے بلکہ اس ذہنی فضا کا دیا و ان کو قرارداد مقاصد، رہنما اصولوں دستور کی صحیح روح اور اس کی دفعات کی احسن تعبیر پر کار بند ہونے کے لیے مجبور کر دے۔ اس کے لیے ناگزیر ہے کہ عوام اپنے آپ کو منظم طاقت بنائیں۔

ثانیاً، اس دستور کے روشن پہلوؤں کو غالب کرنے اور اس کے تاریک پہلوؤں کو ختم کرنے کے لیے جن ترمیم کی ضرورت ہے ان کے لیے ساری قوم اسی طرح سرگرم جدوجہد کرے، جس طرح اب تک دستور بنانے کے لیے لگی گئی ہے۔ درنہ ترمیم کے طریقے کی آسانی سے مخالف اسلام طاقتیں فائدہ اٹھا کر دستور کے روشن پہلوؤں کو اور کمزور بھی کر سکتی ہیں۔

ثالثاً آئندہ اس ملک میں ہونے والے انتخابات میں عوام کو بڑی فرض شناسانہ احتیاط سے اپنی رائے کا استعمال کرنا چاہیے۔ ان کی غفلت کی وجہ سے اگر خود ان کی آراء سے غلط قسم کے لوگ منتخب ہو کر برسرِ اقتدار آئیں اور وہ اس دستور کا ستیاناس کر کے رکھ دیں تو اس بنا ہی کی ذمہ داری خود قوم پر ہوگی اور حکمرانوں کے مقابلے میں عوام کی حاجت ختم ہو جائے گی۔ بخلاف اس کے اگر وہ ایمان و ضمیر کی زندگی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے اندر سے ایسے لوگوں کو آگے لائیں جو دستور کے اسلامی و جمہوری تقاضوں کا شعور بھی رکھتے ہوں اور ایمان داری سے ان کو جہادِ عمل بھی پہنانا چاہتے ہوں، نیز جو اصلاح کر کے! سے ایک معیاری اسلامی دستور بنا دینے کی تڑپ بھی رکھتے ہوں تو پھر نہایت تیز رفتاری سے نظام اسلامی کی تعبیر ہو سکے گی اور ملت کے

صدیوں کے ارمان برآسکیں گے۔

ان سہ گانہ ذمہ داریوں کو ہمارے ایک ایک مسلم شہری کو اس جذبہ و احساس سے اپنے سر لینا چاہیے کہ جیسے تنہا وہی حیاتِ نو کا معمار ہے، وہی اسلام کا فدا کار سپاہی ہے، وہی ملت کی فلاح و بہبود کا پاسان ہے، وہی پاکستان کو ایک اصولی و مقصدی طاقت بنانے کا ضامن ہے۔ ورنہ اگر عام لوگ اپنی اپنی گھٹیا خواہشوں میں مگن رہیں اور اپنے اپنے انفرادی و نجی مقاصد کے درپے رہیں تو پھر آسمان سے فرشتے تو آکر ان کے حصّے کے فرائض کو ادا نہیں کر جاسیں گے

یہ بات بھی عوام کے ذہن نشین ہو جانی چاہیے کہ صرف حکمران طاقت سے مطالبے کرتے رہنے سے زندگی کی تعمیر نہیں ہو جاتی بلکہ کچھ مطالبے اپنے آپ سے بھی کرنے پڑتے ہیں۔ محض یہ خواہش کرنا کہ حکومت ہمیں مسلمان بنادے اور قانون کے زور سے ہماری اصلاح کر دے کوئی نتیجہ نہیں پیدا کر سکتا، تا وقتیکہ آپ خود بھی اپنے آپ کو اپنے اندرونی جذبے سے رضا کارانہ طور پر اسلام کے تابع کر دینے پر متوجہ نہ ہوں۔ قانون کی طاقت صرف اس حد تک کارگر ہوتی ہے کہ کسی اصول و نظام پر برضا و رغبت چلنے والے معاشرے میں افراد کی جو تھوڑی سی تعداد انحراف، بغاوت اور سرکشی دکھاتی ہے اسے بزور سیدھے راستے پر ڈال دیا جائے لیکن اگر عوام بحیثیت مجموعی انحراف پسند ہوں تو بہتر سے بہتر قانون بھی بے بس ہو کر رہ جاتا ہے۔ زیادہ نہیں تو کم سے کم دس پانچ فیصدی شہری تو ہمارے اندر ایسے ہونے چاہئیں کہ جو محض اپنے ایمان کے زیر اثر برضا و رغبت ہر اس مطالبے کو پورا کریں جو اسلام نے ان سے کیا ہے اور ہر اس چیز سے اجتناب کریں جس سے اسلام نے روکا ہے۔ ایسا مختصر نظام اسلامی کی ریڑھ کی ہڈی ہوتا ہے اور یہ آگے لگ کر اوسط درجے کے شریف لوگوں کو ساتھ لے چلتا ہے۔ پھر قانون کا دباؤ بہت بڑی اکثریت کے لیے کارگر ہو جاتا ہے اور جو تھوڑے سے لوگ سرکشی کرنے والے رہ جاتے ہیں ان کو تعزیر و تحدید کے آخری چارہ کار سے روکنا اصلاح لایا جاسکتا ہے۔

ایسے ہی فرض شناس شہریوں سے نیا ہوا معاشرہ تھاجس کے بل پر مدینہ کی معیاری اسلامی ریاست

چلی اور اسی شان سے چلی کہ تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ یہ سبیل تذکرہ ان مقدس شہریوں کی قائم کردہ چند مثالیں ہم یہاں بیان کرتے ہیں۔

عرب کے جاہلی ماحول میں معاشقوں اور بدکاریوں کا دور دودھ تھا۔ دائرہ اسلام میں آنے والے بہت سے لوگ فسق و فجور کے ان طوفانوں میں سے غوطے کھا کھا کر نکلے تھے۔ لیکن مسلمان ہو کر حیب انھوں نے ایک بار یہ تسلیم کر لیا کہ خدا و رسول نے بدکاری کو حرام ٹھہرایا ہے تو اس کے بعد پھر کبھی ان حضرات کے قلب و نظر کا دامن تر نہ ہوا۔ حضرت مرثد ہجرت کے بعد مکہ میں رہ جانے والے کمزور مسلمانوں کو نکالنے کے کام پر مامور کئے گئے تھے اور یہ خفیہ طور پر مکہ پہنچے وہاں عناق نامی ایک طوائف تھی جس سے جاہلیت میں ان کا رابطہ رہ چکا تھا، وہ رات کو کہیں نکلی اور حضرت مرثد کو پہچان لیا۔ دعوت دی کہ رات میرے ہاں گزارے، لیکن انھوں نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ اب وہ دور گیا، اب تو زنا حرام ہو چکی!

ایک خاتون جو زمانہ کفر میں اچھا کردار نہ رکھتی تھیں، ان کو ایک شخص نے ترغیب گناہ دلائی اور اپنی طرف مائل کرنا چاہا۔ ان خاتون نے جواب دیا "ہٹو، اب وہ دن گئے، اب اسلام آگیا ہے!"

حضرت ابو موسیٰ اشعری نے کسی موقع پر فرمایا "مجھے یہ پسند ہے کہ میری ناک مرفار کی بدبو سے بھر جائے، لیکن یہ گوارا نہیں کہ اس میں کسی اجنبی عورت کی خوشبو پہنچے!"

شراب کا عرب میں اتنا علاج تھا کہ گلی گلی میڈے کھلے تھے اور گھر گھر بھیناں لگی تھیں۔ یہ گویا عربی کلچر کا ایک اہم جزو تھی۔ چنانچہ بہت سے لوگ شراب خوری کے عادی تھے اور اسی حالت میں اسلام لے آئے۔ اسلام میں حیب تک صریح ممانعت وارد نہیں ہوئی، شراب کے دور مسلمانوں میں بھی چلتے رہے۔ بس چند اونچے مرتبے کی ہستیاں تھیں جن کے اسلامی ذوق و مزاج نے حرمت کے حکم سے قبل۔ بلکہ اسلام لاتے ہی بنتِ عنب کو طلاق دے دی تھی۔ کچھ ایسے صحابہ بھی تھے جنھوں نے شراب نوشی پر قرآن کی ابتدائی پابندیوں سے اشارہ پا کر ہی اس بلا سے نجات پائی تھی۔ مگر بہت سے لوگوں نے شغلِ نادوش کو جاری رکھا، آخر کار سرورِ مائدہ

میں شراب اور جوئے کی حرمت کا حکم نازل ہوا جس کا اختتام اس سوال پر تھا کہ "فہل انتم منتہون؟" تو کیا اب تم باز آ جاؤ گے؟

حضرت عمرؓ نے یہ دل ہلا دینے والا کلمہ سنتے ہی صدا بلند کی "ابتھینا" ہم باز آئے! حضرت انس بن مالک کا بیان ہے کہ میں ایک مجلس میں ابو عبیدہ، ابو طلحہ اور ابی بن کعب کو شراب پلا رہا تھا کہ اسی حالت میں ایک شخص نے آکر خبر دی کہ "شراب حرام کر دی گئی! ابو طلحہ نے یہ سنتے ہی کہا "انس، اٹھو اور شراب کو زمین پر بندھا دو۔ اس اعلان پر مدینہ کی ہر زبیر سے پرہیز کی کیفیت گذر گئی۔

سودی یعنی دین عرب کے معاشی نظام کا ایک اہم جزو تھا، اور سود کی ممانعت سے نہ صرف یہ کہ بہت سے مہاجروں کے کاروبار چھوٹتے تھے بلکہ کاروباری نظام پر بھی اس کا بھاری اثر پڑتا تھا اور عام لوگوں کے لیے حصولِ قرض میں دقتیں پیدا ہوتی تھیں۔ مگر سود کی حرمت کا جب ایک بار قطعی حکم صادر ہو گیا تو اس کے مطابق جاہلیت کی تمام حاجب الوصول رسوم سود قرض خواہوں نے ساقط کر دیں اور صرف اصل زر پر اکتفا کیا۔ حدیہ کہ وہ معاملات جس میں سود کا شبہ بھی ہوتا تھا، ان سے پورا پورا اجتناب کیا جانے لگا۔ حضرت مالک بن اوس نے حضرت طلحہ بن عبید اللہ کے ساتھ اشرافیوں کے عوض روپے کا تبادلہ کرنا چاہا، حضرت طلحہ نے اشرافیوں سے کہا کہ "اور کہا کہ ابھی خزانچی آجائے تو روپے کی ادائیگی کر دی جائے گی۔ حضرت عمرؓ پاس ہی سن رہے تھے، مالک سے کہنے لگے "دیکھو روپیہ لیے بغیر نہ اٹھنا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ صوفیہ کے بدلے میں چاندی اگر دست بدست نہ لی جائے تو سود ہے۔"

حضرت عمر بن عبداللہ نے اپنے غلام کی معرفت بازار سے ایک صاع گہوں کے بدلے جو منگایا، جو ایک صاع سے زیادہ نکلا۔ انہوں نے فوراً جو واپس کر دیا اور فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ غلہ کو غلہ کے عوض برابر برابر لینا دینا چاہیے۔ پس مجھے خوف ہے کہ یہ سود کے مشابہ نہ ہو جائے۔

عرب کے جاہلی معاشرے میں عورتیں پردہ کے حدود سے نا آشنا تھیں اور کھلے بندوں پھر تیں بلکہ مخلوط



مجلس اور تقاریب میں دھڑلے سے شریک ہوتیں۔ اسلام میں آنے والی خواتین ذہنی انقلاب کے تحت از خود بے حیائی سے ذور ہو کر عصمت مآبی کے مرتبے پر آگئی تھیں، لیکن پردہ کا قانون معاً نافذ نہیں ہوا بلکہ تدریجاً احکام دئے گئے۔ اس معاملے میں بالعموم جاہلی کلچر یہ تھا کہ خورتیں سر پر ایک خاص طرز کے کساوے باندھتیں اور جوڑے کی طرح اس نگرہ پیچھے چوٹی پر لگاٹی جاتی۔ گریبان کھلے رہتے اور گلے کے ساتھ سینے کا ایک حصہ نمایاں رہتا۔ چھاتیوں پر صرف قمیص ہوتی، اور کوئی اتھام نہ تھا۔ دو دو تین تین چوٹیاں پیچھے لہرتی رہتیں۔ سورہ نور میں عورتوں کے لیے حکم آیا اور اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے انچل ڈالے رہیں۔ اس حکم کو سن کر برسوں کے بگڑے ہوئے ذوق اور کلچر کے باوجود مسلم معاشرے کی خواتین کے ماتھے پر بل نہ آئے، اس پر رد و کد نہیں کی گئی، اس پر یہ احتجاج نہیں کیا گیا کہ یہ تو عورتوں کی آزادی میں بے جا مداخلت ہے اور اس سے تہذیب کے دامن پر تنگ خیالی کا داغ لگ جائے گا، اس سے بچنے کے لیے چور دروازے نہیں تلاش کئے گئے، بلکہ مسلم خواتین نے پابندی قانون کی ایک امٹ مثال قائم کر دی۔ لوگوں نے جوہنی اپنے گھروں میں جا کر خدا کے اس قانون کا ذکر کیا تو عورتوں میں فوراً ایک سرگرمی پیدا ہو گئی، ایک ایک خاتون نے تعمیل حکم کے لیے جو کچھ انتظام ممکن تھا آنا فانا کر لیا۔ کسی نے فوراً اپنا کمر پٹہ کھول کر سر و سینہ پر ڈال لیا، اور کسی نے چادر سے دوپٹہ بنا کر اسی وقت اوڑھ لیا۔ اس تعمیل حکم میں باریک دوپٹے بنا کر کسی نے دانستہ خیانت نہیں کی کہ حکم بھی پورا ہو جائے اور حسن و جمال نمایاں بھی رہے۔ ناکبھی سے کسی نے باریک دوپٹہ لیا تو سرورِ عالم نے بالاخص اس کی اصلاح کر دی۔ حضرت عائشہ کا بیان ہے کہ اگلی صبح کو صحتی عورتیں غار کے لیے مسجد نبوی میں آئیں۔ تمام کی تمام دوپٹے اوڑھے ہوئے تھیں، بلکہ بعض خواتین نے تو اپنے آپ کو سیاہ چادروں سے پورن طرح ڈھانپ رکھا تھا۔ حضرت عائشہ مزاحاً فرماتی ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا کہ ان کے سر کووں کے آسپانے بن گئے ہیں اور یہی چادریں دورِ مابعد میں ٹھوڑی سی خیاطی سے برقع کی صورت اختیار کر گئیں۔

اسلام کا جو ضابطہ تجارت نافذ کیا گیا تھا اس کا ایک قاعدہ یہ تھا کہ شہری لوگ (خصوصاً دلال اور آرٹھی) قابل فروخت مال لانے والے دیہاتیوں سے سود سے نہ کیا کریں۔ اس کا مدعا یہ تھا کہ دیہاتی لوگ منہی کے

نرخ سے بے خبر ہونے کی وجہ سے نقصان نہ اٹھائیں اور بازار میں گاہکوں کی مانگ اور ان کی باہمی مسالفت کے ذریعہ طلب و رسد کا فطری قانون ان کو جو فائدہ پہنچا سکتا ہے اس سے محروم نہ رہیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک بدو اپنا مال بیچنے کے لیے حضرت طلحہ بن عبید اللہ سے ملا انھوں نے کہا کہ میں اس طرح تم سے مال نہیں خرید سکتا، تم بازار میں جاؤ، خریداروں کی تلاش کرو، میں جو مفید مشورہ دے سکتا ہوں، دوں گا۔

نبی اکرم نے مسلمان مردوں کے لیے ریشمی لباس کو ممنوع فرمایا۔ حضرت عبداللہ بن عمر نے ایک مرتبہ بازار سے کپڑا خریدا۔ بعد میں دیکھا تو اس میں ریشمی دھاگہ بھی استعمال ہوا تھا، فوراً واپس کر دیا۔

اموال یتیمی کے بارے میں خدا کے قانون نے جس دن یہ انتباہ دیا کہ جو لوگ ظلم کر کے یتیموں کا مال کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں آگ بھرتے ہیں تو عموماً اسلامی ریاست کے شہریوں نے یتیموں کے اموال اپنے اموال سے بالکل الگ کر دئے کہ مبادا غلط فہمی میں رزقِ حلال کے ساتھ حرام کی آمیزش ہو جائے۔

یہ شمار درخشاں مثالوں میں سے یہ چند مثالیں ہم نے پیش کی ہیں۔ ان سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اسلامی ریاست کیسے لوگوں کے دم قدم سے قائم ہوتی ہے اور اسلامی نظام کے اصل معمار کس سیرت و کردار کے لوگ ہوتے ہیں۔ جماعت اسلامی اول روز سے اپنے پروگرام کے جس جز کو سب سے زیادہ اہمیت دے کر کام کر رہی ہے وہ یہی ہے کہ معاشرہ میں سے ایسے آدمی چھانٹ چھانٹ کر منظم کیے جائیں اور تعلیم و تربیت سے مزید تیار کیے جائیں جن کو کسی چیز پر کاربند کر دیتے کے لیے جس یہ علم کافی ہو کہ فلاں بات کو خدا اور رسول نے چاہا ہے اور جن کو کسی چیز سے روک دینے کے لیے بجز اس اطلاع کے اور کسی طاقت کے استعمال کرنے کی ضرورت نہ پڑے کہ کتاب و سنت کے قانون میں یہ حرام اور ممنوع ہے۔ خدا کا بڑا احسان ہے کہ اس گئے گزرے دور میں بھی ہمارے خستہ حال معاشرے کے اندر سے ایسے افراد برابر نکلتے چلے آ رہے ہیں اور مزید کوشش اگر جاری رہے تو یہ عنصر قوم کے اندر موثر ترین طاقت بن سکتا ہے۔

چاہیے یہ کہ نئے اسلامی دستور کا خیر مقدم ہمارے عوام کی زیادہ سے زیادہ بڑی تعداد اس انقلابِ جذبے سے کرے کہ بس اب ہم نئی زندگی کا آغاز کر رہے ہیں، ہمارے اندر سے ایسے لوگ ابھرنے چاہئیں جو یوں

سوچیں کہ ہم ایک اسلامی ریاست کے شہری ہیں اس لیے کسی سے دھاندلی نہیں کر سکتے، ہم ایک اسلامی نظام کے علازم ہیں لہذا رشوت نہیں لے سکتے، ہم ایک پاکیزہ تمدن کے معمار ہیں لہذا نایاب گاڑوں سے دلچسپی نہیں لے سکتے، ہم دنیا بھر کے سامنے حق کی گواہی دینے والے ہیں اس لیے گھٹیا اخلاق کا مظاہرہ نہیں کر سکتے۔

ضرورت اس بات کی بھی ہے کہ اب اپنی ریاست کے بارے میں قوم اپنے نقطہ نظر کو یکسر بدل دے اور اس کے ساتھ اس طرد کا معاملہ کرے جیسا کہ اسلامی ریاست کا استحقاق ہے، حکمران طاقت اور پر اقتدار افراد سے چاہے کتنے بھی اختلافات ہوں اور ان کے کسی نظریے، ان کے کسی طرز عمل، ان کی کسی پالیسی سے کسی ہی شدید بیزاری کیوں نہ ہو، اسلامی ریاست کے جو حقوق اپنے شہریوں پر آتے ہیں وہ کسی حال میں سلب نہیں ہوتے۔ آپ غلط کاموں اور غلط خیالوں کے خلاف احتجاج کرنے اور غلط افراد کو بدلنے کی ساری کوششوں کے ساتھ ساتھ ان حقوق کی ادائیگی میں فرق نہ لائیں جو اسلامی ریاست کی طرف سے عائد ہوتے ہیں اور جس کے لیے ہم میں سے ہر فرد کو خدا کے حضور کل جواب دہ بھی ہونا ہے۔

اب یہ ریاست صرف جاری قوم کا وطن نہیں، بلکہ اسلام کا گھر ہے۔ اسلام کا گھر ہونے کی وجہ سے اب اس کا تقدس تقاضا کرتا ہے کہ ہم اس کے ایک ایک ذرہ خاک کے محافظ ہوں اور اس پر کسی دشمن کی پرچھائیں بھی نہ پڑنے دیں۔ اب اس کا خزانہ، اس کا مال اور اس کے املاک خدا کی امانت ہیں اور ہم میں سے ہر مسلم شہری کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس مال کو اپنے نفس کی دستبرد سے بھی بچائے اور دوسروں کے دستِ خیانت سے بھی اس کی حفاظت کرے۔ اب اس ریاست کی کسی ڈیوٹی اور خدمت کو (جو کتاب و سنت کے قانون سے نہ ٹکراتی ہو) وفاداری اور انہماک سے سرانجام دینا ایک نئی و شرعی فریضہ ہے اور ایک عظیم ترین پیمانے کی اجتماعی نیکی میں حصہ داری کے ہم معنی ہے۔ اب اس کی خدمت کرنا محض پیٹ کی ضرورت نہیں، بلکہ ایمان کا تقاضا ہے۔ اب اس ریاست کے قوانین (معروف کی شرط کے ساتھ) کی اطاعت کرنا بین مذہب و تقویٰ کا معاملہ ہے۔ اب اس ریاست کی ہر معروف سرگرمی میں، دل و جان سے تعاون

کرنا، اس کے ماحول کو ہر منکر سے پاک کرنے کی سعی کرنا، اور اس کے حکمراں جو قدم بھی اسلام کے رُخ پر اٹھائیں اس میں دل و جہاں سے ان کا ساتھ دینا ایک ایک مسلمان کا فرض منصبی قرار پا گیا ہے۔  
عوام کو چاہیے کہ اب وہ اس نقطہ نظر کے ساتھ اپنی ریاست سے معاملہ کریں۔

عامۃ الناس کو ان کی ذمہ داریوں کا احساس دلانا اور ان پر انہیں کاربند کرنا دراصل معاشرے کے ذہین عناصر کا کام ہے۔ یہ فریضہ ہمارے سیاسی رہنماؤں، ہمارے ادیبوں اور شاعروں، ہمارے صحافیوں، اور مصنفوں اور ملن سب سے بڑھ کر علمائے دین پر عائد ہوتا ہے۔ یہاں ہم خصوصیت سے علمائے دین کو ان کے گراں بہا فرض کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں، کیونکہ ایک اسلامی ریاست اور اسلامی معاشرے کے کا تعمیر میں سب سے زیادہ حصہ انہی لوگوں کو ادا کرنا پڑتا ہے جو اسلام میں مرتبہ علم و تفکر رکھتے ہوں۔ ذہنی لحاظ سے تاریخ کی باگ ڈور اسلامی پاکستان میں انہی حضرات کو تھامنی ہے، بشرطیکہ وہ اس منصب عظیم کے مطالبات پورے کر سکیں۔

اس منصب عظیم پر کچھ قابلِ قدر کام کر دکھانے کے لیے اولین ضرورت نئے وسیع اور نیند تر ذہن کی ہے۔ اجتماعی زندگی کے بناؤ سنوارا کام کرنے والوں کو چھوٹے چھوٹے گروہی مقاصد سے بالاتر ہو کر اور جزئی اختلافات کو درکنار رکھ کر باہمی تعاون سے کام کرنا پڑتا ہے۔ اس منصب پر آکر بات بات پر فرقہ پرانی اور تکفیر و تفسیق کے مشعلے جاری نہیں رکھے جاسکتے۔ اور اگر ان مشاغل کو جاری رکھا گیا تو دینی صفوں کا انتشار لادینی طاقتوں کو اسلامی دستور بن جانے کے باوجود موضح مہیا بردے گا کہ اب تک کا کیا کرایا خلافت ہو جائے اور کسی نظام باطل کے لیے چوہا رستے کھل جائیں۔ اگر ایسا ہوا تو پھر علماء کے لیے، سلام کا نام تک لینے کے مواقع نہ رہیں گے اور اس کی ذمہ داری عند الناس بھی اور عند اللہ بھی انہی کے سر ہوگی۔ آج جو عالم دین اپنا فرض نہیں پہچانتا اور چھوٹے چھوٹے جزئی امور پر ہنگامہ آریاں کرتا ہے، اور کسی کے ایمان و اجتنام سے کھیلتا ہے اور گروہی محاذ کھولتا ہے وہ دانستہ نہیں تو نادانستہ کئے کرائے کو غارت کرنے کے درپے ہے۔ اسی طرح اس منصب عظیم پر کام کرنے والوں کو اب لوگوں کو خوش کرنے والے دغظوں، مناظروں اور

فتوے بازیوں کے کھیل تماشے بند کر کے نہایت سنجیدگی سے عوام کے ذہن و کردار کی تعمیر کا خشک اور ٹھوس کام کرنا چاہیے اور اپنے کام کا جائزہ اس پیمانے سے لینا چاہیے کہ کتنی زندگیاں بولیں، کتنے لوگوں کو الحاد اور فسق و فجور، حرام خوراری اور بدکاری کے طوفان میں ڈوبنے سے بچا نکالا، کتنے ذہنوں اور کتنے گھروں میں انقلاب پیدا کر دیا۔ اب ضرورت ہے کہ لوگوں کو جو شیعے پن اور دماغی تفریح کی مزید خوراکین دینا بند کر کے ان کو سنجیدگی، وقار، نظم اور شائستگی کا درس دیا جائے۔ ان کی زبان، بول چال، نشست و برخاست، سیاسی سرگرمیوں معیشت اور گھریلو زندگیوں کو اسلام کے مطابق مہذب بنایا جائے۔

پھر یہ منصبِ عظیم یہ تقاضا بھی کرنا ہے کہ علمائے کرام اپنے خطابات، اپنے درس، اور اپنے علمی کاموں کا دائرہ اثر وسیع تر کر لیں اور اجتماعی زندگی کے تمام مسائل کو اپنا موضوع بنا کر کام کریں، کیونکہ اب پوزیشن یہ نہیں ہے کہ ایک غیر اسلامی نظام تمدن میں محض اسلام کا نام زندہ رکھنے کا سوال ہو بلکہ اب تو خود اسلامی تمدن کی تعمیر کی جانی ہے اور اس کے لیے علم و فکر کا مسالہ فراہم کرنا ہے۔

ان گذارشات کے ساتھ یہ انتباہ دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اجتماعی زندگی کے محل پر جمہوریہ اسلامیہ پاکستان کا بورڈ آڈینز کر کے ہمارے حکمرانوں، لیڈروں، علما اور ہم عام لوگوں نے ذمہ داریوں کے پہاڑ اپنے سر لے لیے ہیں۔ ہم نے ایک بڑا بول بولا ہے، ایک بھاری دعوئی کیا ہے، اور اب اس بول اور اس دعوے کی لاج رکھنا ہم پر واجب ہو گیا ہے۔ اب ہم قومی حیثیت میں جو جو اقدامات کریں گے وہ سب کے سب دنیا کی نگاہوں میں اسلام سے منسوب ہوں گے۔ اب ہماری غلطیاں اور بد کرداریاں اسلام کو بدنام کرنے کا موجب ہوں گی۔ اب اندرون ملک بھی اور بیرون ملک بھی ہماری عملی سرگرمیوں کو اسی حیثیت سے لیا جائے گا کہ یہی اسلام کی تعلیم ہے اور یہی وہ نظام ہے جو کتاب و سنت نے دیا ہے۔ اب اگر اسلامی نظام کی تاسیس و تعمیر کا اعلان کر دینے کے بعد اپنی کوتاہیوں اور نالائقیوں کی وجہ سے ہم ناکام رہ جاتے ہیں تو ہماری یہ ناکامی دنیا کو اور خود مسلمانوں کو سرے سے نظر سے اسلامی سے مایوس کر دے گی، وہ تاریخی حرکت جو تمام عالم اسلامی کنی نسلوں میں اسلام کے حق میں برپا ہے اس پر اس پڑ جائے گی اور مغرب کی محدود مادی تہذیب

نجات پانے کے لیے امید کا کوئی راستہ باقی نہ رہے گا۔

اب ہم کسی کے غلام نہیں، ہمارے اوپر کسی غیر کا تسلط نہیں، ہمارے راستے میں کسی غیر مسلم اکثریت کی سیاسی طاقت سدراہ نہیں، اسلام پر عمل پیرا ہونے میں اب کوئی دستوری روک حائل نہیں، ہم آزاد قوم ہیں، خود مختار ریاست ہیں اور اسلام پر ایمان رکھنے والوں کی بھاری اکثریت ملک میں رکھتے ہیں۔ اب بھی اگر جان بوجھ کر ہم قانونِ الہی سے انحراف جاری رکھتے ہیں اور اب بھی اگر خود ہوشِ نفس کے تحت غیر اسلامی نظریات و رجحانات کا دامن تھام کر چلتے ہیں تو یہ روش اسلام سے غداری اور نفاق کی روش ہی ہو سکتی ہے۔ مسلمان کہلا کر اور اسلام کا جھنڈا ہاتھ میں لے کر پھر جو طاقت آزادی و اختیار کی حالت میں غداری و نفاق کی روش اختیار کرتی ہے اس کے لیے قانونِ الہی بڑا ہی سخت ہے، ایسی قوم کی آزادی تو کجا، سرے سے اس کا وجود ہی ختم کر دیا جاتا ہے۔ یوں بھی تاریخی تجربات اور تمدنی قوانین سے یہ حقیقت قطعی طور پر ثابت ہے کہ غداری و نفاق میں مبتلا ہونے والی قومیں ترقی، آزادی اور زندگی سے محروم کر دی جاتی ہیں۔

پس ہماری آزادی اور ہمارا اسلامی دستور جہاں ہمارے لیے بڑی قابلِ قدر نعمت ہیں وہاں ایک سنگین آزمائش بھی ہیں۔ ہم سب کو پوری جدوجہد کرنی چاہیے کہ ہم اس آزمائش میں ناکام نہ ہوں اور اس نعمت کا لطف اُکھڑ کر کے اپنی دنیا و عاقبت کو تباہ نہ کر لیں۔ خدا ہماری مدد کرے، ہمیں سہارا دے، ہمیں ایمان و عمل کی صلاحیتیں دے اور ہمارے ہاتھوں تاریخ میں ایک دورِ سعادت کا افتتاح کرائے۔ وباللہ التوفیق!

اس موقع پر اچانک جدا ہو جانے والے ایک رفیق کی یاد ذہن میں تازہ ہے جس نے اسلامی دستور کی جدوجہد میں دماغ اور زبان اور قلم اور ہاتھ پاؤں سے پورا پورا حصہ ادا کیا اور جو نئے نئے مرحلے کا نقشہ کار ساتھ لے کر پچھلے دنوں میدانِ عمل میں مصروفِ تگ و تاز تھا۔ ہمارے یہ بیٹا قیمتِ رفیق چوہدری علی احمد خاں تھے۔ مرحوم جماعت اسلامی میں آنے سے قبل محکمہ پولیس میں ملازم تھے۔ لیکن اس محکمے کے معروف عام مزاج کے بخلاف ایک حساس دل اور ایک زندہ ضمیر اپنے سینے میں رکھتے تھے۔ مطالعہ کا شوق ابتداء سے تھا خصوصاً اعلیٰ پایے کا اسلامی لٹریچر، چاہے وہ کسی بھی ادارے سے شائع ہوتا ہو، تلاشِ حق کے سچے جذبہ سے

پڑھتے رہے۔ اسی تلاشِ حق کے جذبے سے مختلف علماء و مفکرینِ اسلام سے خط و کتابت کی، اپنے  
 اشکال ان کے سامنے رکھے اور ان کے باہمی اختلافات کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ مرحوم کے  
 پاس اکابر کے علمی خطوط کا ایک بیش بہا ذخیرہ جمع ہو گیا تھا۔ تلاشِ حق کی یہی کاوش ان کو ایک ایک دروازہ  
 کھٹکاٹھانے کے بعد جماعتِ اسلامی کے اندر لے آئی۔ آئے تو بالفاظِ خوش کشتیاں جلا کر آئے، یعنی  
 نوکری ترک کر دی اور رزقِ حلال کے حصول کے لیے پھلور میں ایک چھوٹا سا ہوٹل کھول دیا جہاں وہ  
 اپنے گاہکوں کی پیٹ کی بھوک مٹانے کا سر و سامان بھی کرتے اور ان کے دلوں اور روحوں کی غذا بھی  
 پیش کرتے۔ اس معاشی ٹنگ و دو کے ساتھ دینی پہلو سے بھی اور جدید علوم کے پہلو سے بھی اپنا مطالعہ  
 روز افزوں رفتار سے جاری رکھا۔ کتابیں خریدنے کا شوق تھا، چنانچہ ایک بیش قیمت ذاتی لائبریری چھوڑی  
 ہے۔ اس لحاظ سے اپنے آپ کو علمی حیثیت سے چھوڑی سی مدت میں ترقی کے جس مرتبے پر پہنچایا، اس کی  
 مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں تقریر و تحریر کی استعداد ہم پہنچا کر زبانِ و قلم سے  
 تحریکِ اسلامی کی بیش بہا خدمات انجام دیں، اور متعدد کتابیں لکھیں جس میں سے کچھ شائع ہو چکی ہیں اور بہت سا  
 مواد قابلِ ترتیب و اشاعت ہے۔ پھر خوبی یہ ہے کہ یہ شخص جماعتِ اسلامی کی صفِ اول میں رہنے  
 اور مختلف اہم انتظامی مناصب کو سنبھالنے کے باوجود ہمیشہ ایک سپاہی اور ایک کارکن رہا۔ تحریک کے  
 دینی و سیاسی اور اصولی و اجتہادی پہلوؤں میں پورا توازن قائم کر کے سوچنے کے لحاظ سے بھی مرحوم نے ایک  
 اچھی مثال قائم کی۔ اوپر سے لے کر نیچے تک اپنے سے بڑے اور اپنے سے چھوٹے رفقا کے ساتھ یکساں  
 محبت و بے تکلفی رکھنے، ذاتی رابطہ قرابت پیدا کرنے، ذہن کو چھوٹی چھوٹی احساساتی الجھنوں سے صاف  
 رکھنے، گفتگو میں ایک مسکراتے پھرے کو اپنا ترجمان بنانے اور کارِ دعوت کے لیے ہر طبقے میں نفوذ کرنے  
 کی مختلف خوبیاں ایک ہی شخصیت میں جمع ہو گئی تھیں۔ جماعت نے جو کام جس مرحلے میں سونپا اسے ذوق  
 و شوق سے لبیک کہا اور پھر اسے خلوص و محنت سے سرانجام دے کر، امیرِ جماعت، ارکانِ مجلسِ شوریٰ  
 اور جملہ رفقا کے دلوں میں خاص جگہ حاصل کی۔ چنانچہ ماضی قریب میں مشرقی پاکستان میں محوِ ناسا عرصہ کام  
 کر کے حالات کو اتنا آگے بڑھا دیا کہ اس کا صحیح اندازہ امیرِ جماعت کے دورہ مشرقی پاکستان پر ہوا۔ حال میں

سلطہ لائل پور کو تنظیمی لحاظ سے مضبوط تر بنانے کی جو طوفانی جدوجہد انہوں نے شروع کی تھی اس کے نتائج چند ہی دنوں میں محسوس ہونے لگے تھے۔ ابھی خدا کے دین کا یہ سپاہی اپنے گھر بار اور اپنی صحت تک سے بے پروا ہو کر دوڑ دھوپ میں محو تھا کہ عین حالت سفر میں عالم جاودانی سے بلافا آگیا۔ اپنے ساتھیوں کو غمزدہ چھوڑ کر اچانک رخصت ہو جانے والے اس قیمتی رفیق کو خداوند تعالیٰ اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ہمیں اس کی مثال سے سبق لینے کی توفیق دے۔ جماعت کی صفوں میں اس کی کمی کو پورا کرے اور اس کے اہل و عیال اور اعزہ و اقربا کو صبر جمیل عطا کرے۔

ہم سب اللہ کے ہیں، اور ہمیں اسی کے حضور لوٹ کر جانا ہے